شفیق الرحمٰن کے افسانے رومان پرور ایام کی سہانی اور مانوس یادیں ہیں۔ وہ ان کی یادوں کو ماضی کے حوالے سے دیکھنے کی بجائے حال میں رہ کر یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی دھوپ میں آئینہ لئے کھڑا ہوا۔۔۔۔ وہ ماضی کی نوحہ گری نہیں کرتے بلکہ زندگی کی خوشیاں ان کے فن میں پھلجھڑیاں بن کر پھوٹتی ہیں۔ زندگی میں انہیں جہاں کہیں کسی المیہ یا تلخ حقیقت سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس کا بیان مسکراتی ہوئی چشم نم سے کرتے ہیں۔ مزاج' شگفتگی' برجستگی اور تھرکتی ہوئی جگمگاہٹ ان کے فن کا حصہ ہے۔ کرنیں' شگوفے' لہریں' مدوجزر' پرواز' حماقتیں' پچھتاوے' دجلہ' دریچے اور انسانی تماشا شفیق الرحمٰن کی وہ یادگار کتابیں ہیں جن کی تازگی وقت کی گرد سے ماند نہیں پڑیں ہے۔ کچی عمر کے حسین خواب' اوائل شباب میں محبوب سے ملاقاتیں اور باتیں شفیق الرحمٰن کے نوک قلم سے قطرہ قطرہ رس ٹپکاتی ہیں اور پڑھنے والا ان کے مجسم فن سے لمحہ لمحہ حظ اٹھاتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کو "ماضی پرست" نہیں کہا جا سکتا ان کے افسانوں میں نوسٹلجیا بے حد Living اور متحرک ہے' جامد نہیں ہے۔ ان کے ہاں ماضی کی بازیافت ماضی کی بحر بیکراں کا حال کے سمندر سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ شفیق الرحمٰن کے کردار' شوخ' کھلنڈرے اور زندگی سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی کثافت کو اپنے فن کی لطافت سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔۔ ان کے افسانوی اسلوب کی پہچان ہنستے ہنساتے سچے کی بات کہہ جاتا ہے۔ وہ یہ بات اس قدر آہنگی کے ساتھ کہتے ہیں' جیسے مدھم سروں میں کوئی دلربا گیت سنائے ۔ شفیق الرحمان شوخ و شنگ لفظوں میں دکھوں سے ماری مخلوق سے اپنے فن کی زبانی یہ کہتے ہیں کہ غم سے نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ "تھوڑا سا رومانی ہو جائیں"..........

طاہر اصغر

اتنے دنوں کے بعد آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا اسے چلاتے وقت جیسے ٹھٹک کر رہ گیا اور نظریں سامنے کھڑکیوں کی جانب مڑ گئیں۔

آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے تختے بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہر طرف موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ رنگ برنگ پرندے سریلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ جب میں نے اور ایک سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی منی گڑیا نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی تھی۔

اس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے مہینہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے بس ایک فقرہ رہ گیا تھا۔ جس کا ورد وہ کرتی رہتی۔ تم ڈرپوک ہو۔ تم ڈرتے ہو۔ تم یوں ہو۔ تم واں ہو۔

کئی بار اس سے کہا کہ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا لیتا ہوں۔ لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں۔ چلانا تو ایک طرف رہا میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ ہے کہ چلانے کے لئے کونسی کمانی گھماتے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں۔

وہ منہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو روز چلاتے ہیں۔ چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا۔ کوئی سبق ہو تو یاد کر لوں۔ وہ تو پینڈل پکڑ کر ایک دلتی سی مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کر آواز آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا کھینچا تانی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے موٹر سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔

تب کہا جاتا ہے "تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے۔ بس ڈرتے ہو نا!"

میں سمجھاتا کہ ابھی موٹر سائیکل کے برابر تو ہم خود ہیں۔ بڑے ہو گئے تو موٹر سائیکل چھوڑ پوری موٹر چلایا کریں گے۔ بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا۔۔۔۔؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی۔ ایک موٹر سائیکل کو ایک لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بتیرا کہتا یہ تصویر فرضی ہے۔ یونہی کسی نے کھینچ دی ہے۔ لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو!

اختر کے کہنے پر میں طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کرکے ابا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بودی۔ اختر کا خیال تھا' کہ پودے میں پہلے تو ننھی منی گھڑیاں لگیں گی۔ پھر ٹائم پیس لگیں گے اور جب پودا بڑا ہو کر درخت بن جائے گا تب کلاک لگیں گے۔ لیکن باوجود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے کچھ نہ ہوا۔

پھر اس کے مجبور کرنے پر بہادر بننے کے سلسلے میں ابا جان کی بندوق چلا دی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔۔۔۔ اختر کہتی تھی کہ جو چیز جانور کو جا کر لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔ یہ گولی اور چھرے یونہی بناوٹی چیزیں ہیں۔ اس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ بندوق چلنے پر گولی تو خدا جانے کہاں گئی۔ البتہ چھت پر ڈبو میاں (جو غالباً بلی سے لڑ کر چھت پر دھوپ سینک رہے تھے) تڑپ کر اچھلے اور ساتھ رکھے ہوئے پانی کے ٹب میں گرے اور وہاں سے اچھل کر روشن دان میں سے ہوتے ہوئے سیدھے کمرے میں جا گرے' جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ خدا جانے ان کی سہیلیوں پر کیا بیتی۔ آپا جان بے حد ناراض ہوئیں' ان کے رنگ برنگے سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے اور وہ کم بخت طوطا یوں دبک گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر پریوں کی بہت سی کہانیاں پڑھنے کے بعد اختر کے کہنے پر ساری رات چھوئی موئی اور نرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گزار دی۔ ہم وہاں پریاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا جال تھا۔ (جس سے ہم تتلیاں پکڑا کرتے تھے) ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے۔ جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اس رات مجھے بڑا ڈر لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سسکیاں آ رہی تھیں۔ جب مرغ کی اذان سنائی دی تو اپنے اپنے کمروں میں جا دبکے۔ صبح صبح ہمیں کھانسی بھی ہو گئی اور زکام بھی۔

سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے' ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں ہم چوٹ رہتی تھی۔ اختر بولی۔ "جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔؟"

"بولی۔ اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو تو ہرگز نہیں کاٹ سکتے۔"

میں نے کہا "کاٹ سکتا ہوں" وہ بولی "بالکل نہیں۔" میں مصر ہوا۔ آخر طے ہوا کہ جب منشی جی اس دفعہ نیت باندھیں' تو میں ان کا کان کاٹ دوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر دوڑ کر چچا جان کی شکاری چھری لے آئی۔ میں نے اچھی طرح چھری پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے۔ اب جو وہ بیٹھے ہیں۔ تو لپک کر ان کا کان مضبوطی سے پکڑا' اور چھری پھیر دی۔ ادھر کان ہے کہ کٹتا نہیں۔ میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال ہے جو منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں۔ بدستور پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پر دو چار نوکر چلے آئے۔ جو دیکھتا ہوں تو چھری الٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دنوں تک ڈرتا رہا کہ اگر چھری کی دھار منشی جی کے کان پر پھیر دیتا' تو واقعی ان کا کان میرے ہاتھ میں آجاتا' اور پھر خون بھی نکلتا۔

ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینما گئے۔ جہاں ہم نے مکے بازی کی ایک فلم دیکھی۔ اختر کو مکا بازی بہت پسند آئی گھر پہنچ کر کہنے لگی آؤ لڑیں۔ مجھے ان دنوں بخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پر گزار کر آئی تھی اور خوب سرخ ہو رہی تھی۔

پہلے تو ٹال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا۔ وہ کہنے لگی۔ تم ڈرتے ہو' خیر مکا بازی ہوئی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے تیز ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لیا اور جب میں نے اسے پرے دھکیلا تو اس نے دوڑ کر میری کلائی میں اس بری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے۔ پھر جو روئی ہے تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ تتلیوں کے سارے پر' چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں۔ گولیاں۔۔۔۔۔۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اسے دیا۔ تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے جنوں' بھوتوں کے قصوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی جھوٹی سچی کہانیاں سنایا کرتی اور میں یقین کر لیتا۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب سیکنڈ شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو استانی

جی پڑھا کر چلی گئیں۔ کمروں میں ڈر لگتا تھا۔ اس لئے ہم برآمدے میں بیٹھے تھے' باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔

اختر نے ایک کہانی شروع کی۔ "اندھیری رات تھی ایک بہت ہی ڈراؤنے اور اجاڑ جنگل میں ایک ٹرین گزر رہی تھی۔ بری طرح بارش ہو رہی تھی۔ ایک لمبے خطرناک سے ڈبے میں صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔"

مجھے ڈر لگنے لگا۔ یہ اختر بھی خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ بھلا ریل کا ڈبہ خطرناک کیسے ہو گیا؟ سوچنے لگا شاید اب یہی ہو گا کہ ایک آدمی دوسرے کی مرمت کرے گا۔ یا چلتی ریل سے باہر پھینک دے گا۔ میں نے اپنی کرسی کھینچ کر اس کے نزدیک کر لی۔

وہ بڑے اطمینان سے کہانی سنا رہی تھی۔ "دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بجلی زور سے کڑکی---- ایک آدمی دوسرے سے بولا۔ "کیوں صاحب آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں؟"

دوسرا بولا۔ "جی نہیں ! میں تو نہیں مانتا۔ اور آپ؟"

پہلا بولا------ "میں تو مانتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دھواں بن کر اڑ گیا۔

"دھواں بن کر اڑ گیا؟ کہاں اڑ گیا؟" میں نے قریب چیختے ہوئے کہا۔

"بھئی غائب ہو گیا۔ دراصل وہ خود بھوت تھا' اور آدمی کا بھیس بدلے بیٹھا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا------ وہ بیچارہ ڈبے میں رہ گیا اس کا جو حال ہوا ہو گا ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی کرسی اور نزدیک کھینچ لی۔

وہ ڈراؤنا منہ بنا کر بولی۔ "اور اگر میں یہاں بیٹھی بیٹھی غائب ہو جاؤں' بس دھواں بن کر اڑ جاؤں تب؟"

میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اتنے زور سے دبوچا جیسے وہ سچ مچ اڑ جائے گی۔ وہ کہنے لگی۔ "اور جو میں انسان نہ ہوں تو---- کچھ اور ہوں؟"

میں اس قدر ڈرا کہ ایسی سرد رات میں اتنا پسینہ آیا کہ کپڑے بھیگ گئے۔ مدتوں یہی سوچا کرتا کیا ہو جو یہ اختر کوئی چڑیل وغیرہ ہی ہو۔

ایک رات امی بولیں۔ "نمو ذرا اندر سے ٹارچ اٹھا لاؤ۔ مالی کہیں باہر جائے گا۔"

میں بڑا دلیر بن کر اندھیرے کمرے میں سے ٹارچ اٹھا لایا۔

اختر بولی۔ "بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ وہ کہانی بھی سنی ہے تم نے اندھیرے کمرے اور ماچس والی؟"

میں سہم گیا۔ "کون سی کہانی؟"

"وہی کہ ایک شخص اندھیرے کمرے میں ماچس لینے گیا۔ اندر سخت تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹٹول رہا تھا کہ یکلخت اس کے ہاتھ میں ماچس تھما دی گئی !۔"

"ماچس دے دی۔ کس نے؟۔"

"نہ جانے کون تھا------ وہ چیخ کر باہر بھاگا۔ لوگوں نے بہیرا تلاش کیا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا ہشیار رہنا چاہئے۔"

اس کے بعد مدت تک میں کسی اندھیرے کمرے میں نہیں گھسا۔

آخر اس کے بار بار کہنے پر تنگ آکر میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور ایک روز موٹر سائیکل چلاؤں گا۔ اختر کو یقین تھا کہ سارا ڈر تب تک ہے' جب تک موٹر سائیکل چلتی نہیں۔ ایک دفعہ چل پڑے تو بس------ یوں لگے گا جیسے معمولی سائیکل چلا رہے ہوں۔

جب کبھی ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل چلاتے تو ہم بڑے غور سے سارا عمل دیکھتے۔ شروع شروع کی باتیں تو سمجھ میں آجاتیں۔ لیکن بعد میں جو تین چار حرکتیں اکٹھی کر جاتے۔ ان کا کچھ پتہ نہ چلتا۔

اختر بولی۔ "تم پوچھ کیوں نہیں لیتے ڈاکٹر صاحب سے۔"

میں نے کہا۔ "بتائیں گے نہیں' اور ممکن ہے کہ ناراض ہو جائیں اور پینے کو سخت کڑوی کسیلی دوائیاں دیں۔"

بولی۔ "تم ڈرپوک ہو"

میں جھلا اٹھا اور سینہ پھلا کر بولا۔ "آج ڈاکٹر صاحب سے ضرور پوچھوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ باہر تک گیا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جو عجیب طرح گھور کر دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ اختر کھڑکی کے پردوں میں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔ "سناؤ بچے ! کیسے ہو؟۔"

"جی بالکل اچھا ہوں------ ایک بات پوچھنے آیا تھا۔ بات یہ ہے کہ---- وہ------ اگر آپ اجازت دیں تو ہم باغ میں جا کر گالیوں اور موجریں---- کھایا کریں۔"

"کیسے مہمل الفاظ استعمال کر رہے ہو برخوردار !--- یقیناً بہت برا املا لکھتے ہو گے۔ میں استانی صاحبہ سے ضرور کہوں گا۔ گالیوں اور موجروں کا کیا مطلب ہے۔ تمہارا؟۔"

"جی---- میں کہہ رہا تھا۔ مولیاں اور گاجریں------ غلطی سے------ وہ!۔"

"اوہو! ہاہاہا------ ہی ہی ہی------ خوب! ہاں گاجریں مفید ہیں اگر تھوڑی مقدار میں کھائی جائیں تب-----!۔"

میں نے بڑی مسکین شکل بنا کر اختر کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا منہ چڑا دیا۔ میں یکلخت ایک بہادر لڑکا بن گیا۔

"ڈاکٹر صاحب !------ ایک بات ہے۔ آپ ناراض تو نہ ہوں گے۔ پوچھوں ؟"

"ضرور پوچھ برخوردار!----- یقیناً تمہارے پیٹ میں درد ہو گا۔ کیوں؟۔"

میں پھر گھبرا گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کی ٹائی بہت خوشنما ہے۔ بالکل اسی رنگ کی ایک تتلی ہم نے پکڑی تھی۔!"

ڈاکٹر صاحب شرما گئے۔

اختر نے میرا منہ چڑایا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مجھے دیکھا اور میں پھر بوکھلا گیا۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ بہت اچھے ہیں۔ اب میں ضرور آپ کا کہنا مانا کروں گا۔ آپ جس وقت چاہیں میری زبان دیکھ سکتے ہیں۔ اگر اب آپ کہیں تو میں حلق بھی دکھا دوں۔ یہ دیکھئے۔"

ادھر دیکھا تو وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چونک پڑے۔ "ننھے! تم ضرور جامنیں کھا کر آئے ہو۔ تمہاری زبان رنگی ہوئی ہے------ اور دیکھو!"

میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔

اختر نے مجھے پکڑ لیا۔ منہ بنا کر بولی۔ "آپ کی ٹائی نہایت اچھی ہے جناب' آپ کی مونچھیں بہت بڑھیا ہیں جناب' آپ بہت اچھے ہیں جناب' ڈرپوک کہیں کے! دو لفظ منہ سے نکلے کہ آپ کی موٹر سائیکل کس طرح چلتی ہے۔ جناب------ !"

میں نے کہا۔ "کسی اور سے پوچھ لیں گے۔ بجلی کا مستری ہے' ڈاکیا ہے' شوفر ہے' استانی جی ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو بتا ہی دے گا۔" لیکن ہمیں کسی نے نہ بتایا۔ شاید قسم کھا رکھی تھی سب نے۔ آخر ہفتہ بھر کی محنت کے بعد مجھے کچھ پتا چل ہی گیا کہ سٹارٹ کس طرح کرتے ہیں۔ اب سوال تھا روکنے کا۔ اختر بولی۔ جب چل پڑے گی۔ تب دیکھا جائے گا۔

کئی روز تک موقعہ نہ مل سکا۔ ڈاکٹر صاحب کو نہ جانے کہاں سے ایک بیہودہ سی موٹر سائیکل مل گئی تھی۔ جب وہ ایک میل دور ہوتے تب سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔ موٹر کا شور اتنا تھا کہ ہارن کی ضرورت نہیں تھی۔ دو چار مرتبہ موٹر سائیکل بھی لائے۔ لیکن فورا واپس چلے گئے۔ پھر یکلخت ان کا آنا بند ہو گیا۔

میں تو دل ہی دل میں خوش تھا۔ لیکن اختر ہر روز مجبور کرتی کہ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔ بڑی منتوں سے کہتا کہ کس طرح بلاؤں آخر؟ ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لئے کم از کم ایک آدھ کو تو ضرور بیمار ہونا چاہئے۔

ایک صبح ہمیں پتہ چلا کہ چچا جان کے سر میں درد ہے۔ فورا سوجھی کہ ڈاکٹر صاحب کو چچا کی طرف سے فون کیا جائے۔ ہم چوری چوری ٹیلیفون کے کمرے میں گئے۔ کمرہ چاروں طرف سے بند کر لیا۔ اختر نے مجھ سے کہا کہ میں موٹی آواز میں چچا جان کی طرح بولوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بھاری آواز آئی---- "ہیلو !۔" میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہے ہے----- لو دو----- !" پہلے آواز بالکل باریک تھی پھر اختر کی چٹکی سے یکلخت موٹی ہو گئی۔

"کون صاحب ہیں ؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہم ہیں----- میرا مطلب یہ ہے کہ میں ہوں (پھر بہت موٹی آواز سے)----- میں ہوں------ !"

"آپ کی تعریف؟"

"میں ہوں چچا جان------ اور میرے سر میں درد ہے۔" ------ (میں گھبرا گیا اور آواز پھر پتلی ہو گئی)------ جناب ڈاکٹر صاحب اس وقت فون پر چچا جان بول رہے ہیں------ آپ ذرا تشریف لے آیئے۔

"صاحب ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے اور میں کہاں آؤں؟ آواز آئی۔" اختر نے میرے ہاتھ میں ریسیور چھین لیا اور بھاری آواز سے بولی۔ "آپ پہچانتے ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ! میں ہوں (چچا جان کا نام لے کر) آپ ذرا آیئے تو سہی !۔"

"اوہ ! ابھی حاضر ہوا ! !"

ہم بھاگے سیدھے باغ کی طرف۔ فوارے کی آڑ میں چھپ گئے۔ پھٹ پھٹ کرتی ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل کوٹھی میں داخل ہوئی۔ انہوں نے حسب معمول اسے برآمدے کے سامنے ٹھہرا دیا اور اندر چلے گئے۔ میرا حلق خشک تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن اختر کو ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور لپکی سیدھی موٹر سائیکل کی طرف۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے ڈانٹا اور ڈرپوک کہا۔ میں ذرا بہادر سا بن گیا۔ ہم نے موٹر سائیکل کو بمشکل ہلا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا طے ہوا کہ پہلے اختر پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور جب میں بیٹھوں تو وہ میری کمر پکڑے۔

جونہی اس نے میری کمر پکڑی۔ میں اچھل کر اتر کھڑا ہوا۔ اتنی گدگدی ہوئی' کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ کہا' یوں نہیں' یوں تو گدگدی ہوتی ہے۔ بولی۔ اچھا اب کوٹ پکڑ لوں گی۔ میں پھر بیٹھا۔ ادھر اس کا ہاتھ لگا اور میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ اس طرح تو میں گر پڑوں گا۔ چلانا تو ایک طرف رہا۔ پوچھنے لگی کہ کہاں گدگدی نہیں ہوتی۔ میں نے کہا۔ بازو پکڑ لو اس نے مضبوطی سے بازو پکڑا۔ ادھر میں پورے زور سے اچھل کر سٹارٹر پر کودا اور موٹر سائیکل سٹارٹ ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب فورا باہر نکلے------ "لینا پکڑنا۔ !"

موٹر سائیکل جو تیزی سے چلی ہے کچھ پتہ نہ تھا کہاں جا رہے ہیں۔ موتیے کے تختوں اور پھول دار بیلوں کو روندتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ فوارے سے بال بال بچے' موڑ پر ڈبو میاں کو بچایا۔ ورنہ وہ نیچے ہی آ چلے تھے۔ پھر موٹر سائیکل یکلخت تیز ہو گئی----- ہم نے ایک قلابازی سی کھائی۔ ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ اور پھر پتہ نہ چلا کہ ہم موٹر سائیکل کے اوپر تھے یا وہ ہمارے اوپر۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بالکل بیہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو سدا بہار کی ٹہنیوں میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ نکلنا محال تھا۔ ہاتھ منہ لہولہان ہو رہے تھے۔ اب جو ہلنے کی کوشش کرتا ہوں تو بازو شل! دیکھتا ہوں کہ اختر بازو سے چمٹی ہوئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ لیکن گرفت اسی طرح ہے۔

بڑی مشکل سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب' چچا جان' اور نوکر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنا بازو چھڑانا چاہا۔ بتیرا کہا کہ اب تو چھوڑ دو ہاتھ۔ لیکن اس کی گرفت بدستور رہی۔ بڑی مصیبتوں سے ٹہنیوں سے باہر نکلا اور ساتھ ہی میرے بازو سے لٹکی ہوئی اختر! موٹر سائیکل سدا بہار کی گھنی ٹہنیوں کے اس طرف نکل گئی تھی اور ہم ٹہنیوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟------ ہمیں دھمکایا گیا۔ ہر قسم کی ڈانٹ دی گئی۔ بزرگوں سے لے کر چھوٹوں تک------ سب نے ہمیں حسب توفیق لیکچر دیئے۔ ٹیلیفون کو ایک اونچی سی الماری پر رکھ دیا گیا۔ (غالبا وہ یہ بھول گئے کہ ہم میزیں رکھ کر بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں) ڈاکٹر صاحب نے توبہ کی کہ وہ کبھی موٹر سائیکل پر ہمارے ہاں نہ آئیں گے۔ اور اسی بیہودہ موٹر میں آیا کریں گے جس سے ہمیں نفرت تھی۔ اختر کے ابا کو یہ ساری کہانی لکھ کر بھیجی گئی۔ ہمیں کسی دور دراز سکولوں پر بھیجنے کی دھمکی دی گئی۔

کچھ دنوں بعد اختر کہیں چلی گئی۔ مجھے بھی کسی اور جگہ پڑھنے بھیج دیا گیا۔ پھر مدت کے بعد اس کی تصویر آئی۔ جس میں وہ ایسی بنی ہوئی تھی کہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی چھوٹی سی ضدی اختر ہے جس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی میں لتھڑے رہتے تھے۔ جس نے میری کلائی میں اس بری طرح سے کاٹ کھایا تھا۔ کئی اور تصویریں آئیں------ ہر نئی تصویر میں وہ سنجیدہ اور مدبر بنتی گئی۔ پھر سنا کہ اس کی کہیں منگنی ہو گئی۔ اس کے خط آنے بند ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔

آج صبح موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے وقت میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یونہی بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گلاب کے تختے سرخ ہو رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے رنگ برنگ پرندوں کی سیٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید پردوں کے پیچھے کوئی نیلگوں آنکھوں اور سنہرے بالوں والی گڑیا میرا منہ چڑ رہی ہو اور باہر ہاتھ نکال کر زور سے کہہ دے۔

"ڈرپوک !"